# جندر: ایک ماحولیاتی مطالعہ

## Jinder: An Eco-Critical Study

ڈاکٹر عابدہ نسیم[i]

Abstract:

*Eco-criticism is a way of compatibility between literature and ecology. It evaluates the role of literature towards challenges faced by ecology in scenario of modern age. Jindar is an important novel written by Akhtar Raza saleemi, which unfolds the problems & complications of ecology due to industrialization & urbanization. It reflects the susceptivity of man and nature's relation. It shows that how does the destruction of nature results in human destruction. This paper explores the understanding of writer towards ecology and represents an eco-critical study of novel Jindar.*

Keywords: *Akhtar Raza Saleemi , Novel, Jindar , Eco-criticism, Eco-critical study.*

ماحولیاتی تنقید ادب اور ماحولیات کے درمیان مطابقت کا ایک طریقہ ہے۔ یہ جدید دور کے منظر نامے میں ماحولیات کو درپیش چیلنجوں کے حوالے سے ادب کے کردار کا جائزہ لیتی ہے۔ جندر اختر رضا سلیمی کا لکھا ہوا ایک اہم ناول ہے، جو صنعت کاری اور شہری کاری کی وجہ سے ماحولیات کے مسائل اور پیچیدگیوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ یہ انسان اور فطرت کے رشتے کی حساسیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت کی تباہی سے انسان کی تباہی کیسے جُڑی ہوئی ہے۔ یہ مقالہ ماحولیات کے تئیں مصنف کی سمجھ کو تلاش کرتا ہے اور ناول جندر کے ایک ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اختر رضا سلیمی ، ناول جندر ، ماحولیاتی تنقید ، ماحولیاتی مطالعہ

اختر رضا سلیمی کا ناول جندر اپنے موضوعاتی اور تکنیکی تجربے کی بنا پر دور حاضر کا ایک اہم نمائندہ ناول ہے۔ ایک سو بیس صفحات کے اس مختصر سے ناول میں مصنف نے عہد حاضر کی اس بھیانک صورت حال کی عکاسی کی ہے جس میں ایک طرف تو میکانکی زندگی کی تیز رفتاری، بڑھتے ہوئے سرمایہ دارانہ صارفی کلچر اور ٹیکنالوجی کی یلغار نے فرد کو تنہا اور بے مایہ کر دیا ہے اور دوسری طرف Industrialization اور Urbanization کی اس دوڑ میں فرد فطرت اور ماحولیات کے درپے ہے اور اسے نگلتا جا رہا ہے۔ ذیل میں اس ناول کو ماحولیات کے حوالے سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ماحولیاتی تنقید کے معیارات کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔

ماحولیاتی تنقید یا Eco Criticism کی اصطلاح زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس کا آغاز تو ولیم رئیکرٹ نے ۱۹۷۸ میں اپنے مقالے سے کیا، تاہم بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اسے امریکہ میں فروغ حاصل ہوا

---

i لیکچرر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف سرگودھا

اور اسے کچھ ایسے مصنفین اور ماہرین میسر آئے جنھوں نے اس کی مبادیات کا تعین کرنے اور اسے ایک تنقیدی پیٹرن بنانے کے ضمن میں حوالے کا کام کیا۔ ماحولیاتی تنقید کا بنیادی موضوع ماحولیات اور فطرت ہے اور یہ اس نظریے کو چیلنج کرتی ہے جس کے مطابق انسان کو اس کائنات میں مرکزیت حاصل ہے اور وہ اپنے عقل و شعور کو بروئے کار لا کر دیگر موجودات و مظاہر کو مسخر کرنے اور زیر تصرف لانے کا حق رکھتا ہے۔ گویا ماحولیاتی تنقید بشر مرکزیت (Anthropocentrism) کے جبر کو توڑنے پر زور دیتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید اپنی نوعیت میں ادبی مطالعات کا ایک طریق کار ہے تاہم اس میں اور دیگر ادبی تنقیدی کلامیوں میں ایک واضح فرق ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے بعد ہونے والی سائنسی و تہذیبی ترقی کے باعث ذہن، منطق اور شعور کو برتری حاصل رہی اور اس کے نتیجے میں پنپنے والے ادبی تنقیدی نظریات مثلاً تاریخیت، مارکسیت، ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، نو آبادیات، مابعد نو آبادیات اور تانیثیت وغیرہ میں انسانی سماج، تہذیب و ثقافت اور تاریخ کو موضوع بنایا جاتا رہا۔ یہ تنقیدی نظریات مندرجہ بالا حوالوں سے انسانی تجربات کی تفہیم و تعبیر کرتے ہیں گویا بشر مرکزیت نظریے کے عکاس ہیں اور علم و ادب کی قلم رو سے فطرت کو بے دخل کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ماحولیاتی تنقید اس تناظر کو وسعت دیتی ہے اور ادب میں صرف انسان کی سماجی و ثقافتی دنیا کی پیش کش تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کا دائرہ پورے کرہ حیات کو محیط ہو جاتا ہے۔ وہ اس ضمن میں روا رکھی جانے والی مغائرت اور ثنویت کو چیلنج کرتی ہے۔۔۔ یہ انسان کے تخلیقی تجربے کو فطرتی اور متن کو فطرتی تشکیل قرار دینے کا مطالعہ کرتی ہے۔ چناں چہ ادب اور فطری دنیا کے مابین رشتوں کے مطالعے سے ان معانی تک رسائی کی کوشش کرتی ہے جن کا منبع فطرت ہے۔ ([۱])

ماحولیاتی تنقید کی بنیاد فلسفہ ماحولیات (Deep Ecology) کے بنیادی اصول پر استوار ہوئی ہے جس کے مطابق ہر شے دوسری شے سے جڑی ہے اور اس طرح ایک ایکو سسٹم قائم ہے۔ کائنات میں موجود تمام موجودات و مظاہر اپنی بقا کی خاطر باہم انحصار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ولیم رئیکرٹ نے اس نظریے کا اطلاق ادب پر کیا اور ادب کی ماحولیاتی شعریات دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بقول جس طرح ماحول میں کوئی شے دوسری سے الگ نہیں اسی طرح ادب میں متن کی تخلیق، ذریعہ تخلیق، مصنف اور قاری باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ

ایک اور ماحولیاتی قانون سے بھی استفادہ کرتا ہے۔ اس کے بقول طبعیات میں سورج محفوظ توانائی کا ذریعہ ہے اور کرہ حیات پر تمام تر زندگی کا انحصار شمسی توانائی پر ہے۔ یہ توانائی تمام مظاہر میں جاری و ساری رہتی ہے، ہمیشہ منقلب ہوتی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح ادب بھی تخلیقی توانائی کا ایک ایسا ذریعہ ہے۔ یہ توانائی بھی بار بار استعمال ہوتی ہے، قوت متخیلہ سے زبان کے مرکز کو اور زبان کے توسط سے نظم میں، نظم اسے منقلب کر کے قاری کی طرف منتقل کرتی ہے، دوران قرات یہ توانائی خارج ہوتی ہے اور زبان کے مرکز سے ہوتی ہوئی پھر قوت متخیلہ کی طرف پلٹتی ہے۔ اس طرح یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ (۲) ناصر عباس نیر ادب اور ماحولیات کے ان مماثلات پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح ماحولیاتی تنقید ساختیات کے مماثل ہو جاتی ہے تاہم ساختیات کے مقابلے میں اس کے باہم رشتوں کا نظام وسیع ہے اور یہ رشتے ثقافت اور طبعی دنیا دونوں کو محیط ہیں، لیکن اس ضمن میں ماحولیاتی تنقید کو یہ تحدید درپیش ہے کہ اسے حقیقت تک پہنچنے کے لیے زبان کے میڈیم کی ضرورت ہے۔ یہ اس کے لیے چیلنج ہے کہ طبعی حقیقت کو سماجی حقیقت میں بدلنے سے کس طرح بچائے اور تخلیقی تجربے کو سماجی و ثقافتی تجربے کے بجائے محض فطری تجربہ کیسے ثابت کرے۔ ادب پر محفوظ توانائی کا قانون منطبق کرنے کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ممکن ہے کہ جیسے جیسے فن پارہ پڑھا جائے اس کی معانی آفرینی کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے تاہم ضروری نہیں کہ ان معانی کا ماخذ فطرت ہو۔ ہو سکتا ہے جن فن پاروں کو سب زمانوں میں پڑھا جاتا ہو وہ بشر مرکزیت تصور کے حامل ہوں، جن معانی کو پیش کیا گیا ہو وہ فطرت کی تسخیر، فطرت کے تصرف اور انسان کی عقلی برتری کے حامل ہوں نیز بشر مرکزیت میں یقین ہی ان ادب پاروں کے مسلسل پڑھے جانے کا باعث ہو۔ ماحولیاتی تنقید کو اس مجبوری کا سامنا ہے کہ ادب میں فطرت کے حوالے سے جو بھی اظہارات کیے جاتے ہیں وہ زبان کے ثقافتی اظہار کے تابع ہوتے ہیں لہٰذا ادب میں فطرت کی پیشکش اپنے حقیقی تصور کے بجائے علامت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں تخلیقی تجربے کے باطن میں بشر مرکزی تصور ہی برقرار رہتا ہے۔ (۳)

ماحولیاتی تنقید کی یہ تحدیدات اپنی جگہ اہم ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے، تاہم ماحولیاتی تنقید کی یہ عطا اپنی جگہ اہم ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ ادب کی اقلیم میں انسان کے ساتھ فطرت کو بھی برابر کا شریک کیا، اسے نظرانداز کرنے،

فرسودہ اور مسخ صورت میں پیش کرنے کے بجائے ایک زندہ وجود کی سطح پر بھرپور نمائندگی دی۔۔۔ ایک تنقیدی موقف کی حیثیت سے یہ ایک طرف ادب سے وابستہ ہے اور دوسری طرف زمین سے۔ جب کہ ایک نظری کلامیے کے طور پر یہ انسانی اور غیر انسانی مخلوق کے مابین مکالمے کی راہ ہموار کرتی ہے۔ (۴)

ماحولیاتی تنقید کا ایک زاویہ ماحولیاتی تانیثیت Eco- Feminism بھی ہے۔ جس طرح تانیثیت مرد اور عورت میں روا رکھی جانے والی مغائرت اور ثنویت سے مزاحم ہے اسی طرح ماحولیاتی تنقید انسان اور ماحول/فطرت کے مابین ثنویت کو چیلنج کرتی ہے۔ یوں دونوں میں Logic of Domination یعنی غلبے کی منطق مشترک قدر کے طور پر کام کرتی ہے۔ (۵) اس کی تاویل کرتے ہوئے ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کہتے ہیں کہ ادب میں فطرت اور انسان کے رشتے کا اظہار جن صورتوں میں بھی ہوا ہے ان میں فطرت کا ایسا منفعل کردار غالب ہے جس سے انسانی ضرورت وابستہ ہے۔ زمین ایک سطح پر انسان کے لیے ماں ہے جو اس کی غذائی ضروریات پورا کرتی ہے اور اسے تحفظ دیتی ہے تو دوسری سطح پر بیوی ہے جس کی پیداواری صلاحیت افزائش نسل کی ضمانت دیتی ہے۔ دونوں سطح پر فطرت/زمین اور عورت مرد کے لیے مفعول ہیں۔ فطرت کا یہ مرد مرکز تصور ایسی ثنویت تشکیل دیتا ہے جس کی رو سے انسان کو فطرت پر اور مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ ماحولیاتی تانیثیت اور تانیثی ماحولیات دونوں اس ثنویت کو رد کرتی ہیں۔ (۶)

عہد حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باعث ماحولیات کی بقا کو خطرات لاحق ہیں۔ طاقت اور تسلط کی خاطر ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ، فضائی اور زمینی آلودگی، آبادی کا بڑھنا، جنگلات اور قدرتی وسائل کا خاتمہ، گلوبل وارمنگ، زمین کا کٹاؤ، جنگلی اور آبی حیات کی معدومیت اور مصنوعی ذرائع پیداوار کے باعث کرہ حیات کا وجود مجروح ہے۔ اس تناظر میں مجموعی طور پر دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ ماحولیاتی تنقید ادبی متون کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کرہ حیات کو درپیش ان خطرات کے حوالے سے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر سوال اٹھاتی ہے:

ادبی متون میں فطرت کی پیشکش کس طرح سے کی گئی ہے؟ کیا فطرت بجائے خود ایک موضوع ہے یا اسے حاشیے پر دھکیلا گیا ہے۔ فطرت کو درپیش مسائل اور خطرات کی حساسیت کو کیا اسی سنجیدگی کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے جس سطح پر انسان کی سماجی اور نفسی دنیا کے مسائل کو پیش کیا جاتا ہے؟ فطرت اور

ماحولیات کی بقا کے ضمن میں ادب، ادیب اور قاری کا کیا کردار ہو سکتا ہے ؟ ماحولیاتی تنقید اور فلسفہ ماحولیات کے بنیادی مباحث کا ادبی متون پر اطلاق کرتے ہوئے ان کی تفہیم و تعبیر کیوں کر کی جا سکتی ہے ؟ ماحولیاتی تنقید انھی سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

یوں ماحولیاتی تنقید ادبی مطالعات کے لیے ایک ایسی اساس مہیا کرتی ہے جس میں انسان کی سماجی دنیا اور طبعی دنیا کے تعامل اور باہم اثر پذیری کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ناصر عباس نیر کے بقول ماحولیاتی تنقید تین زاویوں سے ادبی متون کا تجزیہ کرتی ہے۔ اول یہ کہ ادب کے اصول وہی ہیں جو ماحولیات کے ہیں، دوم یہ کہ انسانی ثقافت اور طبعی دنیا میں مغائرت نہیں اور سوم یہ کہ انسان نے طبعی دنیا کو تسخیر کرنے کے جنوں میں اسے برباد کر دیا ہے اور خود اپنی بقا کو خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ (۷)

ذیل میں ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں ناول جندر کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

موت کے منظر سے شروع ہو کر موت ہی کے منظر پر ختم ہونے والا مختصر سے کینوس کا یہ ناول اپنے اندر زمان و مکان، زندگی اور موت، تہذیبی انہدام اور ماحولیاتی تقلیب سے جڑے کئی سوالات کو جنم دیتا ہے اور یہ سوالات زندگی کے سارے ابعاد کو محیط ہو جاتے ہیں۔ ناول کا آغاز شام کے ایک منظر سے ہوتا ہے جہاں ایک جندروئی بستر مرگ پر لیٹا موت کے انتظار میں ہے اور شعور کی رو میں ماضی جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ جنگل میں ندی کنارے اس جندر کی تخلیق کیوں کر ہوئی اور رفتہ رفتہ زوال پذیر کیسے ہوا؟ اب گذشتہ پینتالیس دنوں سے وہ اپنی معدومیت کی الٹی گنتی گن رہا ہے۔ رات کے پچھلے پہر انتظار مرگ کی اسی کیفیت پر ناول ختم ہو جاتا ہے، تین پہروں کے اس بیانیے میں مصنف نے کئی زمانوں کا سفر طے کیا ہے اور جندر کے ساتھ ساتھ وقت کا پہیا بھی مسلسل گھوما ہے۔ جندروئی کی یہ منتظر موت ایک بہت بڑی موت میں مدغم ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ موت ایک پوری تہذیب کی موت ہے، یہ صنعت و ٹیکنالوجی کے سفاکارانہ تسلط اور انسان کے ہاتھوں فطرت اور فطری مظاہر زندگی کی موت ہے۔ یہ فطرت اور ماحولیات کی تباہی کا نوحہ ہے۔ مصنف نے اس میں فلسفہ ماحولیات کی بہت موثر عکاسی کی ہے اور اس کے علاوہ بن نگاری (Pastoralism) اور فطری منظر نگاری (wilderness writing) کے حوالے سے بہت عمدہ لینڈ اسکیپ کا انتخاب کیا ہے۔

کوہ رمیال کے دامن میں ہزارہ کے وسیع و عریض جنگلات اور ان میں سے گزرتی ہوئی ندی

جوڑیاں جس کے کنارے ایک جندر نصب ہے جس کا جندروئی ناول کا متکلم ہے۔ وسیع و عریض جنگلات کی موجودگی، بہتی ہوئی ندی کا شوریدہ پانی اور جندر کی سریلی گونج سے مصنف نے ایک بہت خوب صورت فطری مرقع کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جندر فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اوراس کی گونج میں فطرت کا قلب دھڑکتا سنائی دیتا ہے۔ مصنف نے اس فطری ماحول کو اس طرح منعکس کیا ہے کہ پورا لینڈ اسکیپ سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں جندر بجائے خود ایک زندہ وجود کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ دو سو سال پہلے متکلم کے دادا کے دادا نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ایک مہینے کے مختصر عرصے میں اسے تعمیر کیا تھا۔۔۔آپ بارہ فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے کسی ایسے کمرے کا اندازہ کر سکتے ہیں جس کی اگلی دیوار کو چھوڑ کر باقی تینوں دیواریں صرف دو در جن کے قریب پتھروں سے بنی ہوں یعنی ہر دیوار صرف آٹھ بڑے پتھروں پر مشتمل ہو۔۔ ان پتھروں کی مخصوص گولائی اور شکل و صورت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھیں ندی سے نکال کر اس کنارے تک لایا گیا تھا۔ گویا اب جو پانی ان کے نیچے سے گزر رہا ہے۔ صدیوں تک ان کے اوپر سے گزرتا ہوگا۔۔ پونے دو سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ اب بھی اسی طرح پھسلواں ہیں جیسے پانی سے نکلتے وقت تھے اور یہ پھسلاہٹ انھیں چھو کر اب بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ (۸)

جنگل میں چاندنی رات کی لحہ بہ لحہ متغیر کیفیت کو گرفت میں لا کر مصنف نے فطرت کو اس کی اصل شکل میں زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔۔ چاند کی سترھویں یا اٹھارویں تاریخ تھی۔۔ چاند مشرقی پہاڑ کی چوٹی والے کاہو کے درخت کی سب سے اونچی پھننگوں سے یوں منہ نکال رہا تھا جیسے کوئی دوشیزہ ندی کے پانی کو آئینہ کیے اپنے منہ پر بکھرے بال سنوار رہی ہو۔ میں کافی دیر کرنیں بکھیرتے چاند کو کاہو کی سیاہ پھننگوں سے علیحدہ ہوتے دیکھتا رہا۔۔ جندر کے پچھواڑے واقع سات قدمی زینے سے کسی کے اترنے کی آہٹ سنائی دینے لگی جو جندر کی سریلی گونج کے ساتھ کبھی آہستہ اور کبھی تیز ہو رہی تھی۔۔ منہ گھما کر چاند کی طرف دیکھا، جو کاہو کی پھننگوں سے خاصا بلند ہو چکا تھا، اتنا بلند کہ اگر کاہو اپنے قد سے دوگنا بھی ہو جاتا تو بھی اس کی سیاہ پھننگیں اس تک نہ پہنچ پاتیں۔ (۹)

ندی کنارے جہاں جندر نصب ہے ایک زمانے میں یہ ان جنگلات کی اہم گزرگاہ ہوا کرتی تھی۔ جنگل اور قصبے کو ملانے کا یہی واحد راستہ تھا اور کسی دور میں یہ کشمیر کو ٹیکسلا سے ملاتا تھا۔ انگریز افسر یہاں سے

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

گزر کر جنگل کا معائنہ کرنے جاتے تھے۔۔۔ یہاں سے گزرنے والے قافلوں کے اونٹوں اور خچروں کے گلوں میں گھنٹیوں کے کینٹھے بندھے ہوتے تھے۔۔ جندر کی گونج ٹن ٹن کے شور سے مل کر ایسا سماں تشکیل دیتی کہ میرا دھمال ڈالنے کو جی چاہتا۔ (۱۰)

ناول میں فطری مظاہر پسندی (Animism) کے رویے کا اظہار بھی ملتا ہے۔ مصنف نے بشر مرکزیت بیانیے کی رد تشکیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی معاشرے کی ثقافتی اور سماجی زندگی اور اس کے اظہاریوں کے متوازی فطرت کے اظہاریے کو زبان دینے کی کوشش کی ہے اور فطرت کو ایک ذی روح کی سطح پر دیکھا ہے۔ فطرت کے احساسات اور کردار کی تجسیم اس بیانیے کی رد تشکیل ہے جس میں انسان کی ثقافتی اور سماجی پیشکش کو اجاگر کرتے ہوئے فطرت کی حقیقی پیشکش کو حاشیے پر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس ناول میں نا صرف جندر بلکہ ندی، نباتات و حیوانات، حشرات الارض اور دیگر جنگلی مخلوقات کو زندہ وجود کی طرح متحرک، متکلم اور جذبہ و احساس سے معمور دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے کرہ حیات کی تصویر ہے جس میں انسان ہی اہم نہیں ہے بلکہ دیگر مخلوقات بھی اتنی ہی اہم ہیں، زندگی جیتی ہیں اور باہم تعامل و تفاعل میں اتنی ہی Respondent ہیں جتنا کہ حضرت انسان۔

جوڑیاں ندی جس کے کنارے ولی خان کا جندر ہے، کو مصنف نے ایک جیتے جاگتے اور دھڑکتے وجود کے طور پر پیش کیا ہے۔ وقت اور موسم کے ساتھ ساتھ ندی کی کیفیت بھی مسلسل متغیر رہتی ہے اور وہ رشتے اور روپ بدل بدل کر ماحول اور انسان کے ساتھ تفاعل کرتی ہے۔۔۔ میں نے ایک ہی موسم کے مختلف اوقات میں اس کے کئی رنگ اور کئی روپ دیکھے۔ صبح کے وقت اس کے بہاؤ میں ایک مانوسیت سی ہوتی اور مجھے اس کی گود میں وہی سکون ملتا۔۔ جیسا کسی بچے کو ممتا بھری ماں کی بانھوں میں ملتا ہے۔ لیکن جونہی دوپہر کا وقت ہوتا۔۔ ایک دم اس میں ایک پراسراریت سی در آتی اور ایک عجیب اور ناقابل توضیح سا خوف میرے رگ و پے میں دوڑنے لگتا اور خاموشی کی چاپ کانوں میں گونجنے لگتی۔ لہریں چٹانیں، درخت، گھاس، کائی، مچھلیاں، پرندے حتیٰ کہ پھول تک اجنبیت کا لبادہ اوڑھ لیتے اور اس کے بہاؤ پر تیرتے درختوں کے سائے مجھے چلتے پھرتے ہیولے معلوم ہونے لگتے۔۔ کنارے چلنے والا رستہ اژدھے کی مانند دکھائی دینے لگتا۔۔۔ جونہی سورج کوہ مل کی چوٹی کی طرف جھکتا، ایک دم منظر تبدیل ہونے لگتا اور تمام چیزیں۔۔ مجھ

سے ہم کلام ہونے لگتیں۔ (۱۱)

مصنف نے فطرت کی قوت گویائی، اسرار اور طلسم کو زباں دیتے ہوئے فلسفہ ماحولیات کی عکاسی کی ہے۔ جب انسان اپنی مغائرت کو ترک کرکے فطرت کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے تو فطرت بھی اس کے ساتھ قربت استوار کر لیتی ہے اور ہم کلام ہونے لگتی ہے۔ اس کے اسرار منکشف ہونے لگتے ہیں۔ ماحول اور انسان کا رشتہ اس سطح پر استوار ہو جاتا ہے جہاں دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں۔۔ ندیے بہاؤ پر ٹھہری رات کے طلسم سے ایک جندر روئی ہی آشنا ہو سکتا ہے۔۔ اس پر اپنی ذات کے اسرار کھلنا شروع ہو جاتے ہیں جو اس کے گرد حیرت کا ایک ہالہ سا تان دیتے ہیں۔۔۔ گوتم بدھ اگر نروان حاصل کرنے کے لیے برگد کے سائے کے بجائے کسی جندر کا انتخاب کرتا تو بہت کم وقت میں اپنی منزل پالیتا۔ (۱۲)

بشر مرکزیت فلسفے کی رد تشکیل کرتے ہوئے مصنف نے دکھایا ہے کہ ماحولیات کی تباہی اور فطری مظاہر کی معدومیت بالآخر انسان کی معدومیت پر منتج ہوتی ہے اور اس طرح ایک طنزیہ بیانیہ وجود میں آتا ہے۔ اس لیے جندر کی معدومیت کے ساتھ لحہ لحہ موت کی طرف بڑھتا ہوا جندر روئی چشم تخیل سے وجود کی ڈی کمپوزیشن کو دیکھ رہا ہے۔ اس رد تشکیل کے ذریعے فطری قوتوں کے ہاتھوں انسانی وجود کی تحلیل اور معدومیت ایک بلیغ استعارے کا روپ دھار لیتی ہے۔ انسان اگر فطرت سے معاندانہ اور بے توجہی کا رویہ اختیار کرلے تو فطرت انتقام پر اتر آتی ہے۔ کبھی زلزلوں، کبھی سیلابوں، کبھی لینڈ سلائیڈنگ اور کبھی دیگر آفات کی صورت میں انسان کو تحلیل کرنے اور مٹانے میں جت جاتی ہے جیسے انسان اس کو مٹاتا آیا ہے۔ ناول میں بھی جنگلی حیوانات اور حشرات الارض کے ذریعے انسان کی معدومیت اور تحلیل کا یہ منظر اسی انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس ضمن میں مصنف کا مشاہدہ اور علم قابل تحسین ہے۔ کردار کے دماغ میں شعور کی رو چل رہی ہے اور وہ اپنی متوقع تحلیل کا منظر سوچ رہا ہے کہ کیڑے مکوڑے اور دیگر جنگلی مخلوقات کس طرح اس کے وجود کا خاتمہ کریں گے۔ سب سے پہلے چیونٹیاں اسے نوچنا شروع کریں گی۔۔

وہ مجھے نوچ کر لے جانے کا آغاز میری آنکھوں کے سفید حصے سے کریں گی جو اس وقت تک مزید سفید ہو چکا ہوگا۔ پہلے مرحلے میں آنے والی چیونٹیوں کی ٹولی، رضائی میں لپٹے دھڑ پر سے سفر کرتی ہوئی زرد ہو چکے میرے چہرے تک پہنچے گی تو اسے میری سفید آنکھیں آٹے کی مانند لگیں گی۔ ٹولی میں موجود

چیونٹیاں پہلے تو اپنے چھ پیروں میں سے دو درمیانے پیروں کو مضبوطی سے جما کر کھڑی ہو جائیں گی پھر اگلے دو پیروں کو حرکت میں لا کر میری آنکھوں کا ماس کھودنے اور پچھلے دو پیروں کے ذریعے ایک طرف ہٹانے کی کوشش کریں گی۔۔۔ پھر وہ اپنے پیروں کے بجائے سر پر لگی زندہ قینچی کو عمل میں لا کر انھیں کترنا شروع کر دیں گی۔ اسی دوران میں وہ ایک نامعلوم مواصلاتی رابطے کے ذریعے زیر زمین اپنے تاریک گھروں میں موجود باقی ساتھیوں کو بھی فوراً آگاہ کر دیں گی اور اطلاع پاتے ہی وہاں موجود بے شمار چیونٹیاں گھروں کے برآمدوں میں بے حس و حرکت لٹکی اپنی ٹوکریوں کی طرف دوڑ پڑیں گی اور اس وقت تک اپنی نوکیلی مونچھوں کے ذریعے انھیں بار بار چھوتی رہیں گی جب تک وہ زندہ ہو کر حرکت نہ کرنے لگیں۔ جوں ہی ٹوکریاں حرکت کریں گی ان کے جبڑے کھل جائیں گے اور ان کے لبوں سے رس کے قطرے ٹپکنا شروع ہو جائیں گے، ہر چیونٹی اپنی اپنی ٹوکری کا رس چاٹتے ہی تازہ دم ہو کر میری طرف چل پڑے گی اور ان کا یہاں آنا جانا اس وقت تک لگا رہے گا جب تک میرے چہرے پر ماس کا ایک ریشہ بھی باقی ہے۔۔ سانپ، چھپکلیاں، لال بیگ اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی اس سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے، لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہوں گے جنھیں میرے باسی گوشت سے زیادہ ان زندہ چیونٹیوں سے دلچسپی ہو گی۔۔ ہاں جب کوئی کیڑا مکوڑا اجنبی جنس کے کیڑے مکوڑے کو جا دبوچے گا تو چیونٹیوں کے ہاتھ بھی کچھ تازہ گوشت لگ ہی جائے گا اور وہ میرے جسم کو چھوڑ کر اس کی لاش پر پل پڑیں گی۔ کچھ چیونٹیاں میرے کھلے منہ کے رستے پیٹ کی طرف اور کچھ نتھنوں کے ذریعے دماغ کی طرف سفر شروع کریں گی۔ (۱۳)

یہاں چیونٹیوں کا دماغ کو خاص طور پر نشانہ بنانا بھی معنی خیز ہے۔ اسی دماغ کی بنا پر بشر مرکزیت بیانیہ قائم ہوا ہے۔ انسان نے اپنے عقل و شعور کی بنا پر دیگر مخلوقات کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھا اور انھیں تسخیر کرنے اور تصرف میں لانے کو اپنا استحقاق مان لیا۔ یہ ثنویت بڑھتے بڑھتے تباہی کے اس دہانے پر آ گئی ہے جہاں معاملہ انسان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور وہ فطرت کی طرف سے جوابی کارروائی کی زد پر ہے۔

ناول میں انسانی ڈی کمپوزیشن کے اس عمل میں چیونٹیوں کے ساتھ ساتھ گھوڑی ڈینچ، بجو اور اود بلاؤ کا بھی تذکرہ ہے۔ اود بلاؤ جو مچھلیوں اور مینڈکوں کی تلاش میں ندی سے وابستہ چھوٹے تالابوں میں

پھرتے ہیں، ان کے دانت کاہو کی مضبوط ٹہنیاں کاٹ کر ندی کے بہاؤ کے آگے بند باندھ کر پانی کو تالابوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ بجو انسانی ٹخنوں میں موجود خفیہ رگ سے واقف ہے، اسے پکڑنے سے مردے بھی چلنے لگتے ہیں اور وہ انھیں اپنے ساتھ چلا کر اپنے غاروں میں لے جاتے ہیں۔ (۱۴) متکلم کو لگتا ہے کہ یہ سب مخلوقات باری باری اس کے مردہ وجود سے اپنی ضیافت کریں گی۔

اس ناول کے ذریعے مصنف نے ہماری توجہ اس خطرے کی طرف مبذول کروائی ہے جو فطرت اور فطری نظام زندگی کی تباہی کی صورت ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور انسان ہے کہ اپنی زندگی کی تیز رفتاری اور مقابلے کی دوڑ میں اسے مسلسل پس پشت ڈالتا جا رہا ہے۔ ولی خان کی استعاراتی موت کے ذریعے مختصر سے بیانیے میں مصنف نے عصر حاضر کے اس بھیانک منظر نامے کو تمام پہلوؤں کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اگر دنیا کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی، قدرتی وسائل کے بے جا تصرف، کیمیاوی اور میکانکی طریقہ ہائے پیداوار کے سامنے بند نہ باندھا جا سکا تو بہت جلد دنیا تباہی کے دہانے پر ہو گی۔ ان تمام عناصر کا پردہ چاک کیا گیا ہے جو ماحولیاتی تباہی کا سبب ہیں۔ ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب معاشرہ بہت زیادہ نہیں پھیلا تھا اور بڑے شہروں کی طرف منتقلی میں تیزی نہیں آئی تھی تو مشینوں کے بجائے افرادی قوت پر زیادہ انحصار تھا اور لوگ ماحول دوست طرز زندگی کے حامی تھے۔ انسانی معاشرت اجتماعیت مرتکز تھی اور انسان فطرت کی آغوش میں سکون کی زندگی بسر کرتا تھا۔ زمین سے انسان کا رشتہ اٹوٹ تھا اور اس سے بے وفائی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ گویا ماحولیات کے اس بنیادی اصول کی عکاسی کی گئی ہے کہ ہر شے دوسری سے جڑی ہے۔

پھر یوں ہوا کہ سائنس نے ترقی کی اور دنیا میں صنعتی انقلاب آگیا۔ صنعت کا پہیہ چلانے کے لیے قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ دھڑا دھڑ مصنوعات خلق ہونے لگیں، ان کی کھپت کے لیے منڈیوں کی تلاش ہوئی اور دنیا سرمایہ دارانہ جنون میں مبتلا ہو گئی۔ شہر پھیلنے لگے اور جنگل و بن سکڑنے لگے۔ اس طرح ماحولیاتی اختصار وجود میں آتا گیا۔ انسان کا جوں جوں مشین پر انحصار بڑھتا گیا، ماحول سے مغائرت بھی بڑھتی گئی۔ مصنف نے صفحہ ۹۶ سے ۱۰۳ میں تفصیل سے انسانی ثقافت کے ان اجتماعیت مرتکز طریقہ ہائے پیداوار اور وسائل زندگی کا ذکر کیا ہے جو ایک کلی نظام میں باہم جڑے ہوئے تھے۔ اس نظام میں فطرت بھی برابر کی شریک تھی اور ایک ناگزیر جڑت نے سب کو ایک دوسرے پر انحصار کرنے اور ایک دوسرے کو قبول

کرنے پر آمادہ کر رکھا تھا۔ اس میں فصلوں کی کاشت اور مکانات کی تعمیرات کے لیے لیتری اور پھوچھی کی روایت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔۔۔ گاؤں والوں سے میرا رشتہ اس وقت نہیں ٹوٹا جب تک گاؤں والے ٹریکٹر نامی فتنے سے آشنا نہیں ہوئے۔ اس فتنے نے۔۔ میرا رابطہ۔۔ پچیس سال پہلے اسی طرح منقطع کر دیا تھا جیسے پیٹرول سے چلنے والا مصنوعی جندر آج حقیقی زندگی سے میرا رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر رہا ہے۔ (۱۵)

اسی طرح رفتہ رفتہ نظامِ زندگی مشین پر منتقل ہوتا گیا، مشین نے اجتماعیت اور جڑت کے بجائے انفرادیت اور خود انحصاری کا درس دیا اور Eco System کے بہت سارے عناصر کو بے مصرف اور ناکارہ بناتی چلی گئی اور وہ معدوم ہوتے گئے۔ یوں فطری نظام کا توازن بگڑ گیا اور انواع کی بے دخلی کا آغاز ہو گیا۔ مغائرت اور لاتعلّقی بڑھنے لگی اور زمین سے قربت اور جڑت اس کے استحصال میں بدلنے لگی۔ گاؤں سے بیل مفقود ہو گئے اور افزائشِ نسل نے بھی کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔ ٹریکٹر، تھریشر اور اس قبیل کی دیگر مشینوں نے آدمی کو پہلے زمین کی اور پھر آپس کی جڑت سے آزاد کر دیا۔۔۔ اب ہر آدمی آزاد اور خود مختار تھا۔۔ خود مختاری غیر محسوس طریقے سے لوگوں کی رگوں میں دوڑنے لگی اور لوگ ایک دوسرے سے کٹتے چلے گئے۔۔ قبریں مزدوری پر کھودی جانے لگیں۔۔ سوائے شادی بیاہ اور ماتم کے گاؤں میں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ (۱۶)

سرمایہ داری کے اس جنون نے ٹیکنالوجی پر اندھا دھند انحصار کر کے ایکو سسٹم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ پیداوار کا حصول اور اس کو ممکن بنانے کے لیے نوآبادیات، گلوبلائزیشن، کمرشلائزیشن، کنزیومرازم اور مارکیٹنگ جیسے حربوں نے دنیا کو ایک عالمی منڈی بلکہ گوپی چند نارنگ کے بقول ایک تماشا سوسائٹی میں بدل کر رکھ دیا۔ (۱۷) اس سارے تماشے کے نتیجے میں فطرت اور کرہ حیات کو شدید خطرات لاحق ہو گئے اور ماحولیات کے بہت سارے انواع و مظاہر معدومیت کے سفر پر چل پڑے۔ ناول میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ٹیکنالوجی کی نت نئی مصنوعات کی کس طرح مارکیٹنگ کی جاتی ہے اور کس طرح کے کاروباری حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ان کی ضرورت پیدا کرتے ہوئے وقت اور محنت کی بچت، افرادی قوت پر انحصار کے بجائے خودکاری، زیادہ سے زیادہ منافع اور تیز ترین ترسیل جیسے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی سے چلنے والے جندر کی جگہ پٹرول سے چلنے والی مشین اور آٹا فیکٹریوں نے لے لی اور بیلوں کی جگہ ٹریکٹر نے

لے لی۔ سات سال پہلے جب۔۔ بیٹے نے مسجد کے خادم کو بجلی سے چلنے والی مشین لگا کے دی تھی تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ وہ ایک تہذیب کے خاتمے کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کی موت کا سامان بھی کر رہا ہے۔(۱۸) گویا انسان نے فطرت سے بے توجہی کے جس سفر کا آغاز اپنی تعمیر و ترقی کے واسطے کیا تھا انجام کار وہ اس کی تباہی کا سبب بن گیا۔ اس رستے پر چل کر انسان نے کتنی ہی فطری انواع و اقسام کو فنا کے گھاٹ اتارا تھا۔

یہاں سماجی ماحولیات اور ماحولیاتی مارکسیت کا یہ پہلو بھی پیش نظر رہے جس کے مطابق سرمایہ دارانہ طاقتیں اور جدید ٹیکنالوجی طلب و رسد کی حرکیات پر اثر انداز ہوتی ہیں اور طلب میں اضافے، پیداوار کے اخراج اور پیداواری عمل میں تبدیلی جیسے معاشی حربے اختیار کر کے قلّت میں اضافے یا کمی کا باعث بنتی ہیں اس لیے بعض مفکرین کا خیال ہے اگر معاشرے کا سیاسی ڈھانچہ تبدیل کر دیا جائے اور ارتکاز دولت کو پیداوار میں بدل دیا جائے تو سرمایہ دارانہ نظام کی خود ساختہ ضروریات میں مستقل اضافے کی وجہ سے پیدا ہونے والے ماحولیاتی مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔(۱۹) لہٰذا جندر کی جگہ آٹے کی جدید مشینوں کی تنصیب کو طلب و رسد کے عدم توازن کے اس تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

یہاں مصنف نے اس طنزیے کو بھی نمایاں کیا ہے کہ عہد جدید کے اس مادہ پرستانہ معاشرے میں ماحول دوستی، فطرت کی طرف مراجعت، جنگلوں دیہاتوں اور فطری مراکز کے قریب زندگی (Pastoralism) کو پسماندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مروجہ سماجی معیارات کے مطابق اسے جہالت، باعث ندامت اور دماغی خلل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جنگل میں جندر چلانے والے ولی خان کا بیٹا بڑے شہر میں ایک بڑا افسر ہے۔ اس کے لیے باعث ندامت ہے کہ وہ ایک جندروئی کا بیٹا ہے اور اس کا باپ جنگل میں ندی کنارے ایک جندر میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ مصر ہے کہ ولی خان کچھ تو بیٹے کی عزت کا خیال کرے اور یہ گھٹیا کام چھوڑ کر شہر جا کر پر آسائش زندگی بسر کرے۔(۲۰)

ولی خان کو جندر سے علیحدگی منظور نہیں، یہی وجہ ہے کہ اب اس کی موت یقینی ہو چکی ہے۔ ناول کا یہ اختتامیہ انتہائی بلیغ ہے۔ جندر اپنی سطح سے بلند ہو کر ایک بہت بڑی موت کی علامت بن جاتا ہے، اس کی ہوک ماحولیات اور کرہ حیات کی ہوک بن جاتی ہے کہ اگر اس معدومیت کا مداوا نہ کیا گیا تو صورت حال ایک

بہت بڑی تباہی پر منتج ہو گی۔ یہاں جندر اور جندروئی باہم ایک ہیں۔ اگر فطرت کی آواز پر کان نہ دھرا اور انسان یوں ہی فطرت کے درپے رہا تو فطرت انتقام لے گی اور یہ انسان کی تباہی ثابت ہو گی۔

جن لوگوں نے گھومتا جندر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب گھومتے پاٹوں کے اوپر لٹکی نالی سے پاٹوں کے سوراخ میں دانے گر رہے ہوتے ہیں تو اس کی گونج میں ایک خمار بھری سرشاری ہوتی ہے، چوں کہ یہ سرشاری صرف محسوس کی جا سکتی ہے اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اس لیے اگر آپ نے کبھی جندر کے گھومتے ہوئے پاٹ نہیں دیکھے تو اس سرشاری سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتے اور نہ درد بھری اس کوک کے بارے میں جان سکتے ہیں۔۔ جب جندر کا کھارا خالی ہوتا ہے اور اسے دانہ پانی نہیں مل رہا ہوتا۔۔۔ خمار بھری گونج یک دم درد اور یاسیت بھری کوک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کچھ دیر تک اسے مسلسل سنتے رہنے کے بعد یہ کوک آپ کو اپنے وجود کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی ہوک معلوم ہونے لگتی ہے۔۔ گذشتہ پینتالیس دنوں سے روح تک بخیے ادھیڑنے والی اس کی یہ دکھ بھری کوک سن رہا ہوں اور اب یہ مجھے۔۔ اپنے معدوم ہوتے وجود کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔۔ یہ کوک اتنی شدید ہے کہ، میرا گوشت۔۔ ہڈیوں سے علیحدہ کرکے رکھ دیا ہے۔ اب تو گھومتے پاٹ کے ہر چکر پر میں اپنے گوشت کے ریشوں کو ہڈیوں سے علیحدہ ہوتے ہوئے باقاعدہ محسوس بھی کر سکتا ہوں۔ (۲۱)

یہاں جندر کی عمدہ تجسیم کے لیے مصنف کی مہارت اپنی جگہ مگر سرشاری سے کرب انگیزی کا یہ سفر انسان کو آئینہ دکھانے کے لیے کافی ہے۔ درد و یاسیت کا یہ منظر نامہ اس بات کا غماز ہے کہ اگر جندر کے خالی کھارے کو دوبارہ دانہ مل جائے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے اور جندروئی کی متوقع موت ملتوی ہو سکتی ہے، اس التوا کا اختیار انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر مشین اور مل کا پیٹ بھرنے کے بجائے کچھ دانے جندر کے پیٹ میں بھی جا پڑیں تو شاید جندروئی بچ جائے۔۔ مگر ایسا کون کرے؟؟؟؟

یہاں جندر کو مصنف نے ایک علامت کی سطح پر استعمال کیا ہے اور یہ علامت نہایت بلیغ اور پہلو دار ہے۔ اس لیے جندر کو محض جندر سمجھنا محلِ نظر ہے۔ یہ جندر فطرت کی آواز ہے۔ فنا کی طرف بڑھتی فطرت اور کرہ ارض کی معدومیت کے آگے اگر بند باندھ لیا جائے تو موت کو آواز دیتی جندر کی ہوک کو زندگی آمیز سرشار گونج میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اسی میں انسان کی بقا بھی مضمر ہے۔

اس ساری بحث کے نتیجے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی باشعور ادیب اپنے گردو پیش سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا، ماحول چاہے نفسی اور سماجی ہو چاہے طبعی، ادیب کو یکساں متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ادب نے ماحول کے ضمن میں دردمندانہ رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ فطرت اور فرد کے مابین معاندانہ رویے کا بیانیہ اب متزلزل ہو چکا ہے اور اس تعلق کی تفہیم ایک نئی سطح پر ہو رہی ہے جہاں اس کی حساسیت کا ادراک موجود ہے۔ مختصر سے کینوس میں مذکورہ ناول میں مصنف نے فطرت کو فرد سے مکالمہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے اور کئی سوالات اٹھائے ہیں۔ ناول یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر انسان دنیا کو رہنے کے لیے ایک بہتر جگہ بنانے کا خواہاں ہے تو اسے دنیا کو ایک حیاتیاتی کرے کے طور پر تسلیم کرنا ہوگا۔ فطرت کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کر کے ماحولیات کا تحفظ یقینی بنانا ہوگا ورنہ بہت جلد وہ اس ماحول سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا جس میں آج زندہ ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ماحولیاتی تنقید کا منہاج ایک بہتر زندگی کی تشکیل کے لیے وسیع القلبی اور کشادہ نظری کا رویہ پروان چڑھانے میں معاون ہو سکتا ہے اور اس کے مطابق فن پارہ محض ثقافتی ہی نہیں طبعی رشتوں کے نظام کا بھی اظہاریہ ہے اور اس کے معانی اسی کلیت سے ہی برآمد کیے جا سکتے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، "ماحولیاتی تنقید: پس منظر، آغاز اور امتیازات"، مشمولہ: بنیاد (لاہور: گرمانی مرکز زبان و ادب، لمز یونیورسٹی، ۲۰۱۹)، جلد ۱۰، ص ۲۰۔

۲۔ ولیم روئیکرٹ، "ادب اور ماحولیات: ماحولیاتی تنقید میں ایک تجربہ"، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، مترجمہ: ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی (لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع اول، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۰۰۔

۳۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، "ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں"، مشمولہ: تحقیق نامہ، (لاہور: شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷)، شمارہ: ۲۱، ص ۲۱: ۲۳۔

۴۔ شیرل گلاٹفیلٹی، "ماحولیاتی تنقید: آغاز وارتقا اور امکانات"، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، مترجمہ: ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، ص ۱۶۔

۵- گریگ گیرارڈ، "ماحولیاتی تانیثیت، ماحولیاتی مارکسیت اور سماجی ماحولیات"، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، مترجمہ: ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، ص ۲۲۳۔

۶- ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، اردو ادب: ماحولیاتی تناظر (لاہور: سنگ میل پبلشرز، ۲۰۲۲ء)، ص ۲۱۳۔

۷- ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں، ص۲۱۔

۸- اختر رضا سلیمی، جندر (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص ۳۰۔

۹- ایضاً، ص ۴۸: ۵۰۔

۱۰- ایضاً، ص ۲۶: ۲۴۔

۱۱- ایضاً، ص ۱۷۳: ۱۷۴۔

۱۲- ایضاً، ص ۷۴۔

۱۳- ایضاً، ص ۱۶: ۱۷۔

۱۴- ایضاً، ص ۱۸: ۱۹۔

۱۵- ایضاً، ص ۹۶۔

۱۶- ایضاً، ص ۱۰۳۔

۱۷- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، "مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں"، مشمولہ: اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۱۔

۱۸- اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۱۷۔

۱۹- گریگ گیرارڈ، "ماحولیاتی تانیثیت، ماحولیاتی مارکسیت اور سماجی ماحولیات"، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، مترجمہ: ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، ص ۲۲۹۔

۲۰- ایضاً، ص ۱۱۴۔

۲۱- ایضاً، ص ۵۵: ۵۶۔